ڈاکٹر روِش ندیم
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

انشائیہ نگاری: شناخت اور اردو روایت وتسلسل

Essay writing was started in 6th Century AD in France and it had its own literary characteristics. In English literature, its tradition was established in two ways: literary characteristics and academic essayused in various disciplines of knowledge. Later on first one was given new names like "personal essay" or "light essay" to differentiate it from others. In Urdu, the tradition of essay writing was started in 19thCentury AD. Dr.Wazir Agha was the first critic who termed it as "Inshaia" to differentiate creative essay from other kinds of "mazmoonnigari". Now it has its own literary history and tradition in Urdu. This paper gives an overview of the tradition and evolution of "InshaiaNigari" in Urdu

------(۱)------

انشائیہ کے ابتدائی نقوش کی تلاش میں قبل مسیح کے ادیبوں اور مفکروں مثلاً کنفیوشس، پلوٹارک، سائیسرو یا افلاطون، ارسطو اور ان کے معاصر تھیوفراسٹس کے خاکوں یا سینیکا کے خطوط وغیرہ تک بھی پہنچا جاسکتا ہے۔لیکن ان سے نہ تو انشائیہ کا کوئی ارتقا مرتب ہوسکتا اور نہ ہی کوئی تاریخ۔ جس شخصیت نے ان منتشر نقوش کو تاریخ کے ایک خاص مرحلے پر ترتیب دے کر ایک باقاعدہ صنف کی صورت دی وہ فرانس کا مشیل دی مونٹین (Michel de Montaigne) (۱۵۹۲۔۱۵۳۳) تھا۔ اس نے ۱۵۸۰ء میں اپنی دو کتابیں شائع کیں اور essai (essay) کا لفظ پہلی بار اپنے انشائیوں کے لئے اپنی ایک کتاب ''ایسّے آف مونتین'' میں استعمال کیا۔ مونٹین نے اپنے ادبی تجربے کو Essay (Essai) کہا۔[۱] کیونکہ ''اس کا شمار کسی متداول صنف ادب میں نہیں ہوسکتا تھا اس لیے اسے essai کا نام دیا جس کے معنی ہیں: (کچھ کہنے کی) کوشش۔''[۲] اس نے ''ایسے کے ضمن میں لکھا 'لفظ نیا سہی مگر انداز پرانا ہے' اس ضمن میں اس نے سینیکا کی ''Epistles to Lucilius'' کا بطور خاص ذکر کیا۔''[۳] ان میں اس نے اپنی ذات کا اظہار اور شخصی تجربات و تاثرات کو ہلکے پھلکے انداز میں پیش کیا۔ ان تحریروں میں شگفتگی، آزادہ روی اور غیر رسمی اندازِ بیان نمایاں ہے جس سے اس کی شخصیت نے قاری سے دوستانہ انداز اور بہت اچھے مُوڈ میں اپنی پسند و ناپسند پر ہر حوالے سے گفتگو کی ہے۔ ان تحریروں میں مصنف کی ''میں'' بہت واضح ہے۔ مگر نہ تو یہ انا متاثر و مرعوب کرنے والا کوئی عمل ہے اور نہ ہی تبلیغ و شہرت کا کوئی ہتھکنڈہ۔ بلکہ یہ ایک باذوق شخصیت کا اظہارِ ذات ہے۔ لہٰذا مونٹین اپنی کتاب کے آغاز میں لکھتا ہے کہ:

اے قاری! یہ ایک دیانتدارانہ کتاب ہے لہٰذا آغاز ہی میں تنبیہ کردی جاتی ہے کہ واحد مقصدِ تحریر ذاتی اور گھریلو ہے۔

مجھے نہ تو آپ کی خدمت مقصود ہے اور نہ ہی حصولِ ناموری، ایسا منصوبہ میری قوت سے باہر ہے۔ یہ عزیزوں اور دوستوں کی تفریحِ طبع کے لئے ہے کہ مجھے کھو دینے کے بعد ۔۔۔ میرے کردار اور مزاج کی کچھ خصوصیات کی بازیافت سے وہ میری یاد کو زیادہ مکمل اور زیادہ روشن طور پر محفوظ رکھ سکیں۔۔۔لہٰذا اے قاری! اس کتاب کا موضوع میں خود ہوں ۔ اس لئے اپنی فرصت کے لمحات ایسے بے ثمر اور غیر سنجیدہ موضوع پر ضائع کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔[۴]

مونٹین کے essai شگفتگی ،آزادہ روی ، غیر رسمی اظہار اور انکشاف ذات کی وجہ سے مقبول ہوئے۔جب ان کی شہرت انگلینڈ پہنچی تو وہاں کے ''(جان)فلوریو نے مونٹین کا پہلا ترجمہ ۱۶۰۳ء میں کیا۔''[۵] ان انشائیوں سے متاثر ہو کر اسی کے ایک شناسا انگلینڈ کے سر فرانسس بیکن (۱۶۲۶۔۱۵۶۱)نے بھی Essays کے نام سے اپنی کتاب ۱۵۹۷ء میں شائع کر دی۔یوں مونٹین کی وفات کے پانچ سال بعد بیکن نے انگریزی میں انشائیے کا بیج بویا۔ اسی دوران فرانسیسی نقاد اور مونٹین کا مداح سینٹ ایورمون (Saintevermond) ۱۶۶۲ء سے ۱۶۷۰ء تک ایک طویل عرصہ لندن میں رہا جس کو مونٹین سے خصوصی عقیدت تھی۔ابراہم کاؤلے (Abraham Cowley) جسے ہمارے ناقدین نے ابراہیم کاؤ لے بھی لکھا ہے اس کا دوست تھا ۱۶۶۸ء میں اس نے بھی اپنی انشائیوں کی کتاب Several Discourses By Way of Essay شائع کی۔یوں انگلستان میں مونٹین کے انشائیوں کی مضبوط بنیادیں رکھ دی گئیں۔[۶] یہ وہ صورت حال تھی جس کے تحت انگریزی میں انشائیہ نگاری کو فروغ حاصل ہوااور مونٹین کے essai انگریزی میں essay کہلائے ۔اس طرح سے انگریزی زبان میں ایک نئی صنف یعنی essay کی بنیاد پڑی۔

انشائیہ کی صنف کا حقیقی باوا آدم تو فرانس کا مونٹین تھا۔لیکن انگریزی ادب میں کچھ کے نزدیک اس کا باوا آدم بیکن ہے اور کچھ کے نزدیک ابراہم کاؤلے۔دراصل مونٹین کے انشائیہ کے حقیقی فنی لوازمات کا جس قدر خیال ابراہم کاؤلے نے رکھا ہے وہ بیکن کے ہاں مکمل طور پر موجود نہیں ہے۔ کیونکہ بیکن کے ہاں محبت کی بجائے فلسفیانہ استدلال اور ذات کے عمل دخل کی بجائے منطقی عمل غالب ہے۔کیونکہ ''مونٹین ایک دوست کی طرح نمایاں ہوتا ہے ۔۔۔(جبکہ)بیکن ایک فلسفی کی طرح ہم سے دور اور اپنی خودداری میں مخمور رہتا ہے۔''[۷] بعض کے نزدیک مونٹین اور بیکن میں فرق دراصل دو قوموں کے مزاج ،سوچ اور زاویہ نگاہ کا ہے کچھ کے نزدیک دو شخصیتوں کے مزاج،سوچ اور زاویہ نگاہ کا ۔بیکن ایسیز کو''افکار پریشان(Dispersed Meditation) کا نام دیتا ہے اور یہی اک چیز ہے جو بیکن سے ایک حد تک قریب لے آئی ہے ،وگرنہ دوسری باتوں میں دو مونٹین سے قطعاً الگ نظر آتا ہے''۔[۸] لیکن حقیقت یہ ہے کہ بیکن اور کاؤلے کا فرق essay کی دو روایات کا موجب بن گیا۔یعنی مونٹین کے essai کے زیر اثر جب وہا ں essay writing یعنی انشائیہ نگاری کا آغاز ہوا تو یہی مسئلہ پیدا ہوا ،یعنی وہاں کے ادیبوں نے مونٹین کے essai سے متاثر ہو کر بظاہر تو انشائیہ نگاری کو اپنا لیا مگر اس کے فنی لوازمات کو مکمل طور پر ملحوظ نہ رکھا۔مثلاً بیکن نے مونٹین کے انشائیہ کی روح کو پیش نظر نہیں رکھا۔گویا''بیکن نے مونٹین سے انشائیہ کی ہئیت تو حاصل کر لی تھی لیکن اپنے مضامین پر فرانسیسی مزاج کا سایہ نہیں پڑنے دیا۔''[۹] اسی لئے اس کی تحریروں میں غیر رسمیت ، اختصار ، آزادہ روی اور شگفتگی وغیرہ کے عناصر مکمل طور پر مونٹین کی انشائیہ نگاری کا ساتھ نہیں دیتے بلکہ انشائیہ کی جگہ وہ تحریر بن جاتے ہیں جنہیں ہمارے ہاں عرف عام ''مضمون'' کہا جاتا ہے۔لیکن ابراہم کاؤلے نے مکمل طور پر مونٹین کے انشائی فن کی روح کے عین مطابق لکھا۔اس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ''انشائیہ میں اگر

بیکن کی مجوزہ ہیئت اور مزاج کو زیادہ عرصے قبول عام حاصل رہتا تو یہ صنف بالآخر مقالے یا مضمون میں ضم ہو جاتی۔ انگریزی ادب کی خوش قسمتی ہے کہ اسے بہت جلد ابراہیم کاؤلے جیسا انشائیہ نگار میسر آ گیا جس نے عالمانہ اسلوب سے انحراف کر کیا اور انشائیہ کو دوبارہ انکشاف ذات کی ڈگر پر ڈال کر اس کے اصلی مزاج کی تجدید کر دی۔''[۱۰] یوں انگریزی میں essay دو مختلف انداز تحریر کی روایات میں پروان چڑھا۔ اول: بیکن کا انداز۔ دوم : ابراہم کاؤلے کا انداز۔ مثلاً گولڈ سمتھ، جانسن، لی ہنٹ ، جی کے چسٹرٹن، اے جی گارڈنر، رابرٹ لنڈ، چارلس لیمب، ورجینیا وولف اور ولیم ہیزلٹ ایسے نام ہیں جنہوں نے انگریزی ادب میں مونتین کی فنی بنیادوں پر انشائیہ نگاری کو استحکام بخشا۔ گو ایڈیسن کا دعوٰی ہے کہ جو تحریریں لکھنے سے پہلے ذہن میں کسی خاکہ کے بغیر یوں ابھریں کہ ''میرے ذہن پر متعدد خیالات ہوں جنہیں میں بغیر کسی کاوش کے اس طرح قلم بند کرتا چلا جاؤں کہ وہ ایک دوسرے میں سے پھوٹتے دکھائی دیں۔۔۔(یہ) انداز تحریر سینیکا اور مانتین سے منسوب ہے۔''[۱۱] مگر ٹیٹلر (۱۷۰۹ء)، سپیکٹیٹر (۱۷۱۱ء) کے ایڈیسن اور سٹیل نے اپنے بیشتر انشائیوں کو اصلاح معاشرہ کی خاطر وہ انداز بخشا جو مونتین سے کسی قدر انحراف پر مبنی تھا۔ جبکہ براؤن نے اپنے مذہبی و اخلاقی، جان لاک نے فلسفیانہ، میکالے نے تاریخی، آرنلڈ نے تنقیدی، رسکن نے جمالیاتی اور رسل نے مفکرانہ مضامین کے لئے essay کی اصطلاح کو استعمال کیا۔ جس سے انشائیہ کا حامل essay عام مضمون نما essay کے وسیع کل کا صرف ایک حصہ بن کر رہ گیا۔ دراصل ''انشائیہ بنیادی طور پر ایسے ہی ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ انگریزی ادب میں ایسے کی اصطلاح بے حد وسعت کی حامل رہی ہے اور اس کے تحت خالص ایسے (انشائیہ) کے علاوہ ہر قسم کے سنجیدہ، طنزیہ، مزاحیہ، اصطلاحی اور فلسفیانہ مضامین لکھے جاتے رہے ہیں۔''[۱۲] یعنی ہم کہہ سکتے ہیں کہ ''غیر محتاط انگریز مصنفین نے اس اصطلاح یعنی essay کو ہر قسم کی تحریروں کے لیے اس قدر بے احتیاطی سے اور اس حد تک بے دریغ استعمال کیا کہ اس کا صنفی تشخص ہی خطرے میں پڑ گیا۔''[۱۳] یہی وجہ ہے کہ جدید انگریزی انشائیہ نگاروں نے خود کو عام essay لکھنے والوں سے الگ رکھنے کے لئے light essay یا persoanal essay کی اصطلاح استعمال کرنا شروع کر دی۔ لہٰذا آج عام essay writing (مضمون نگاری) کے متوازی persoanal essay (انشائیہ) ایک الگ ادبی پہچان رکھتا ہے۔ ''انگریزی کے جدید انشائیہ نگاروں نے جائز طور پر اپنے ایسیز کو پرسنل ایسے کی اصطلاح سے موسوم کیا کیونکہ ایسے دیگر انواع کے ایسیز سے الگ کرنے کے لیے یہی ایک طریقہ تھا۔ اردو میں انشائیہ کی اصطلاح اسی پرسنل ایسے کے متبادل رائج کی گئی۔''[۱۴] اوپر دیئے گئے انشائیہ نگاروں کے علاوہ ڈیفو، چارلس ڈکنز، سٹیونسن، میکس، سٹیفن لیکاک وغیرہ نے بھی انگریزی ادب میں انشائیہ نگاری کے حوالے سے اہم خدمات سرانجام دی ہیں۔

------(ب)------

اردو انشائیے کی تلاش میں کچھ محققین یا تو ملا وجہی کی ''سب رس'' تک جا پہنچے[۱۵] یا کچھ سرسید کے مضامین پر ہی ڈٹے رہے[۱۶] لیکن عام طور پر انگریزی کا لفظ essay اردو میں ''مضمون'' کے طور پر ہی لیا جاتا ہے جو کہ سنجیدہ تنقیدی و تجزیاتی تحریروں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ ایسے ہی فلسفیانہ ا،دبی ، مذہبی، سماجی، سائنسی اور سیاسی مضامین کا آغاز ماسٹر رام چندر نے اپنے پندرہ روزہ رسالے ''فوائدالناظرین'' (۱۸۴۵ء) اور ''خیر خواہ ہند'' (محبّ ہند) (۱۸۴۷ء) کے ذریعے دہلی سے کیا تھا۔[۱۷] وہ انگریزی کے مترجم اور دہلی کالج میں آزاد، حالی اور ذکاء اللہ وغیرہ کے استاد تھے۔ یہ وہ دور ہے جب ابھی سرسید احمد خاں آثارالصنادید کی صورت

میں مقفٰی و مسجع نثر ہی لکھ رہے تھے ۔ ماسٹر رام چندر نے اپنے مضامین میں بیکن اور ایڈیسن کی تعریف بھی کی ہے اور اپنے مضامین کو'' انگریزی ایسے کے مترادف قرار''[۱۸] دیتے ہوئے ان کے لیے اردو لفظ ''مضمون'' ہی استعمال کیا ہے۔''ڈاکٹر سیدہ جعفر، ڈاکٹر صدیق قدوائی اور ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی سبھی انہیں اردو میں انشائیہ کی صنف کا بانی قرار دے رہے ہیں۔''[۱۹] یہ مضامین بھی سر سید کے مضامین کی طرح ہی مزاج کے حوالے سے خالصتاً سنجیدہ ،فکری اور تنقیدی ہیں اور اردو میں اولین کاوش ،نثر کی پسماندگی اور اصلاح کے غلبے کے باعث سر سید کے مضامین کی طرح ہی مونتین کی بجائے بیکن کی روایت کا تسلسل ہیں۔

سر سید نے مضمون نگاری کا آغاز اپنی اصلاح پسندی کے تحت دورہ انگلستان سے واپسی پر ۱۸۷۰ء میں ''تہذیب الاخلاق'' سے کیا تھا۔ اس کا خیال ان کے ہاں سر رچرڈ سٹیل کے ہفتہ میں تین بار چھپنے والے مجلّے ٹیٹلر (Tatler) اور جوزف ایڈیسن کے (سٹیل کے اشتراک سے) چھپنے والے روزنامہ سپیکٹیٹر (Spectator)[۲۰] جیسے ''انگریزی کے قدیم اصلاحی رسالوں کی فائلوں کو دیکھنے'' سے پیدا ہوا تھا۔[۲۱] اردو میں اپنی مضمون نگاری کی ایجاد کا اظہار انہوں نے اپنے مضمون ''ترقیِ علمِ انشا'' میں کیا ہے۔مگر انہوں نے اپنی تحریروں میں کہیں ماسٹر رام چندر کا ذکر تک نہیں کیا حالانکہ ماسٹر رام چندر کے بھائی شنکر داس سر سید کے دوستوں میں سے تھے۔ایڈیسن اور سٹیل کو'' لنڈن کے پیغمبر'' اور'' سولزیشن کے دیوتا'' قرار دینے والے اور ''افسوس یہاں کوئی ایڈیسن اور سٹیل نہیں'' پکارنے والے سر سید نے اپنی تحریروں میں کئی جگہ ان دو شخصیات کے ذکر کے علاوہ ایک جگہ مونتین کے حوالے سے بھی لکھا ہے کہ''۔۔۔سولہویں صدی میں مونتین صاحب نے جو ایک مشہور فرنچ عالم تھے خصلت و عادات پر کچھ مضمون چھپوائے۔'' مگر پھر بھی سر سید کے ہاں مونتین کی انشائیہ نگاری کا اثر صرف بحث و تکرار، امید اور خوشامد میں ہی ملتا ہے۔ حالانکہ'' تہذیب الاخلاق میں ان کے بعض مضامین انگریزی ترجمے ہیں''۔[۲۲] گو سر سید احمد خان نے ایڈیسن اور سٹیل کے Periodical essays سے متاثر ہو کر ہی تہذیب الاخلاق میں مضمون نگاری کا آغاز کیا۔لہٰذا بقول سید عبداللہ سر سید کی مضمون نگاری ایڈیسن اور سٹیل کی بجائے بیکن سے مماثلت رکھتی ہے۔[۲۳] کیونکہ ان کے ہاں'' موڈ کا تصرف کم ہے اور غور و فکر اور منطق کا حصہ زیادہ ہے۔''[۲۴]

سر سید کی تحریروں کے لئے مضمون اور مقالات کے الفاظ essay کے ترجمے اور مترادف کے طور پر استعمال کئے گئے ۔آج کل عام زبان میں ادبی اصناف سے ہٹ کر نثر میں لکھی گئی ہر تحریر مضمون کہلاتی ہے۔حتٰی کہ اس کے شعبے یعنی تاریخی مضمون، سماجی مضمون، مذہبی مضمون وغیرہ کا بھی کم ہی ذکر کیا جاتا ہے۔جس طرح کہانی کا لفظ داستان، افسانہ ، ناول ،ڈرامہ ،مثنوی ہر جگہ جوڑا جاسکتا ہے اسی طرح مضمون کا لفظ بھی کسی بھی سیدھی سادی تحریر کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔اسی لئے اسے بطور ایک صنف کے ادب میں علیحدہ سے کوئی اہمیت حاصل نہیں ۔جبکہ essay (ایسّے بطور انشائیہ) اپنی بنیاد میں ایک ایسی صنف کے طور پر پروان چڑھا تھا جس میں مصنف کے ذاتی تجربات اور شخصی رنگ نمایاں رہتا ہے۔ اس کے اظہار میں ایک خاص طرح کی شگفتگی اور مزاج میں داخلیت اور آزادہ روی ہوتی ہے ۔اس میں گہری سوچ اور فلسفیانہ استدلال کی جگہ زندگی اور اس کا تنوع زیرِ بحث آتا ہے۔بقول ڈاکٹر جانسن :

"A loose sally of the mind, an irregular indigested piece, not a ragular and oderly composition" [۲۵]

ان خصوصیات کی حامل تحریر کے لئے light essay اور persoanal essay کے الفاظ بھی استعمال کئے گئے ہیں۔اسی لیے نظیر صدیقی نے لکھا کہ ''ذاتی طور پر میں انشائیے کو ایسے کا نہیں بلکہ پرسنل ایسے کا مترادف سمجھتا ہوں۔''[۲۶] essay انہیں خصوصیات کی بنا پر علمی وتنقیدی مقالے (thesis) سے مختلف ہوتا ہے۔جس کی بنیاد منظّم و منضبط علمی سنجیدگی، طرز استدلال، تفکر، تعقل، طے شدہ سوچ، خارجیت اور معروضی انداز ہوتی ہے۔اس میں مسائل کا تجزیہ، اظہار علم اور منطقی استدلال سے کام لیا جاتا ہے۔اس کی زبان اور اسلوب بھی کسی چاشنی یا ذائقے سے خالی ہوتا ہے۔گویا مضمون ایک طرح سے مختصر مقالہ نگاری ہی کا ایک انداز تصور کیا گیا ہے۔اسی لئے یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے ہاں essay (انشائیہ) اور مضمون ایک دوسرے کے متبادل و مترادف کے طور پر رواج پا گئے ہیں۔essay اور مقالے (thesis) کے فرق کو سمجھنے کے لئے سرسید احمد خاں سے متعلق ڈاکٹر عبداللہ کے اس اقتباس سے مدد لی جاسکتی ہے۔ان کے بقول:

> سرسید کے بعض مضامین میں essay کی سی جزویت اور ناتمامیت بھی پائی جاتی ہے۔ایک اچھا مضمون اصولاً کسی مرکزی موڈ کا متقاضی ہوتا ہے جس کے اردگرد خیالات کا تارو پود خود بخود تیار ہوتا جاتا ہے۔اچھا مضمون کڑی منصوبہ بندی یا پہلے سے مرتب کئے ہوئے خیالات کا محتاج نہیں ہوتا۔اس کی تہیں خود بخود کھلتی چلی جاتی ہیں۔سرسید کے بعض مضامین میں یہ خوبی بھی پائی جاتی ہے۔مثلاً امید کی خوشی، بحث وتکرار، اور گزرا ہوا زمانہ: ان مضامین میں یہ خوبی بھی پائی جاتی ہے کہ ان میں معلومات یقینی کی بجائے تخیلات کا غلبہ ہے ۔ یوں سرسید کے مضامین کی معلوماتی سطح عموماً کرخت ہوتی ہے۔مگر اچھے مضامین میں وہ تصویریں اور خوشنما نقوش تیار کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ مثلاً مضمون ''سراب حیات'' میں صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے، سے ابتدا کی گئی ہے۔اس کے بعد عمدہ مکالمہ آتا ہے۔ ایک خیال سے دوسرا خیال پیدا ہوتا چلا جاتا ہے، تصویریں بنتی ہیں، نقوش ابھرتے جاتے ہیں، پڑھنے والے کا دل مضمون کی تہوں میں الجھتا جاتا ہے اور بات دل میں بیٹھتی جاتی ہے اور مجموعی تاثر پر مسرت ہوتا ہے۔[۲۷]

ڈاکٹر سید عبداللہ ان کے غیر انشائی مضامین کو ان کی طوالت، علمی اصلاحی معلومات کی بھر مار اور سخت منصوبہ بندی کے باعث اس لیے رد کرتے ہیں کہ مضمون پر لطف نہیں رہتے بلکہ محض فکری، اخلاقی، اصلاحی اور خشک ہیں۔یوں علمی مقالات یا علمی بحث کے اعتبار سے ان پر کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا مگر انشائی مضمون کی سی شگفتگی ان میں نہیں پائی جاتی ۔اسی لئے حامد حسن قادری کو بھی کہنا پڑا کہ ''سرسید کی کتابوں سے زیادہ ان کے مضامین مفید ہیں جن سے اردو میں فن مقالہ نگاری پیدا ہوگیا۔''[۲۸] یہ وہ صورت حال ہے جس کے باعث اردو میں انشائیہ نگاری اسی دوعملی کا شکار ہوگئی جس کے تحت انگریزی ادب میں مونٹین اور بیکن کے دو متوازی رجحانات پروان چڑھے تھے ۔لہٰذا انشائیہ نگاری کے حوالے سے سرسید کے بعد کی تاریخ انہیں دو رجحانات کے آپس میں گتھم گتھا ہونے کی تاریخ ہے۔اسی لئے اردو میں مضمون نگاری اور انشائیہ نگاری کی تاریخ مرتب کرنے والوں کو ایک ہی طرز کے ادیبوں کے مال سے الگ الگ چھانٹی کرنی پڑتی ہے۔کیونکہ ''لوگ انشائیہ، مضمون، مقالہ اور تنقید میں فرق نہیں کرتے ہیں کیونکہ ان میں سے ہر ایک کے مقاصد الگ الگ ہیں اور ہر ایک کی حدود جدا جدا ہیں۔''[۲۹]

------(ج)------

سرسید کی اصلاح پسندی ، مقصدیت اور اجتماعیت پسندی کے زیر اثر ان کی مضمون نگاری میں پائی جانے والی انتہائی سنجیدگی، روکھے پن اور معروضیت کے ردعمل میں ماسٹر رام چندر کے شاگرد مولانا محمد حسین آزاد کی انشا پردازی ''نیرنگ خیال'' کے مضامین کی صورت میں سامنے آئی۔انشاء پردازی نظم و نثر میں مصنف کے اظہار کا ایک ایسا فن ہوتا ہے جو اس کی تحریر کے وصف کے طور پر سامنے آتا ہے۔ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ سرسید اور آزاد دونوں کے مضامین کلی طور پر essay کی تمام خصوصیات کے حامل و ترجمان نہ ہونے کے باوجود بنیادی طور پر essay کی تقلید ہی میں لکھے گئے تھے۔نیرنگ خیال (۸۳۔۱۸۸۰)کے دیباچہ میں آزاد کے''essay اور جواب مضمون'' جیسے الفاظ کے اشارات کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر محمد صادق نے نہایت وضاحت اور ثبوت کے ساتھ لکھ دیا ہے کہ نیرنگ خیال کے مضامین طبع زاد نہیں بلکہ ترجمہ ہیں۔ انہوں نے انگریزی انشائیوں کے اصل ماخذات کی فہرست بھی پیش کی ہے جن میں جانسن اور ایڈیسن کے ایسیز کی عبارات بھی دی گئی ہیں۔[۳۰] اس لئے ان کے مضامین کو انشائیہ نگاری سے خارج کرنا کافی مشکل ہوجاتا ہے۔لیکن ان پر یہ اعتراض ہے کہ اسلوب کے تکلف،شخصیت کی عدم عکاسی اور آزادہ روی کی بجائے ضبط و ربط انہیں انشائیہ سے خارج کرتا ہے۔گویا ان مضامین میں اگر ایک طرف essay کی خصوصیات مثلاً اختصار، ناتمامیت، اسلوب کی دلکشی وغیرہ پائی جاتی ہیں تو دوسری طرف ان میں عام مضمون کے لوازمات مثلاً خیالات کی سالمیت، واقعاتی انداز، اسلوب کا تکلف و تصنع، غیر شخصی پن، اصلاح پسندی اور آزادہ روی کی کمی وغیرہ بھی موجود ہیں۔اسی لئے ان پر متضاد آراء پائی جاتی ہیں لیکن ان میں انشائیہ کے ارتقا کے حوالے سے ابتدائی نقوش کو واضح طور پر ضرور دیکھا جاسکتا ہے۔ڈاکٹر انور سدید نے آزاد اور سرسید کے حوالے سے درست لکھا ہے کہ ''ایڈیسن، سٹیل، جانسن اور مل سے خوشہ چینی کر کے آزاد اور سرسید نے جو چراغ جلایا تھا اس کی روشنی دور دور تک پھیلتی چلی گئی اور ادبا کی تخلیقی نثر نے ہی انشائی ادب کا روپ اختیار کر لیا۔''[۳۱]

اسی دور کے مولوی ذکاء اللہ نے بیکن کے ایسّے On Study کا ترجمہ ''کتب کا مطالعہ'' کے نام سے کیا اور اپنا طبع زاد انشائیہ ''آگ'' لکھا۔ حالی کے ہاں بھی ایسی دو ایک کاوشیں کل جاتی ہیں جیسے زبان گویا اور جب زمانہ۔۔۔وغیرہ۔عبدالحلیم شرر کے مضامین شرر اور مقالات شرر میں ہم تم اور وہ،عمر رفتہ،صحبت برہم، نسیم سحر اور نہیں وغیرہ طبع زاد انشائیوں کی اولین کاوشیں ہیں۔ ڈاکٹر بشیر سیفی اردو میں شرر کو اس صنف کا باقاعدہ آغاز کرنے والا لکھتے ہیں اور ڈاکٹر احرار نقوی کے فسانہ آزاد کے پنڈت رتن ناتھ سرشار کے انشائیوں کے دعوے کو انور سدید کی طرح تسلیم نہیں کرتے ۔[۳۲]

بیسویں صدی کی ابتدائی تین دہائیوں میں سامنے آنے والے انشائی نثر نگار نہ تو سرسید کی مقصدیت اور اصلاح کے زیر اثر تھے اور نہ ہی ایڈیسن اور سٹیل سے۔پھر ان کا انگریزی کا براہِ راست اور جدید ترین ادب کا مطالعہ اردو نثر کی وسعت کے ساتھ مل کر نئے مسائل و موضوعات سے آشنا کر رہا تھا۔اس تبدیلی کا اثر ان کے اسلوب پر بھی پڑا تھا۔اس وقت تک ہندستان کے سماجی سیاسی حالات بھی کافی حد تک سکون میں آچکے تھے جس کے باعث انشائی نثر نگاروں کے ہاں سکون ،طمانیت اور شگفتگی کا عنصر پہلے کی نسبت بڑھ گیا تھا۔تمثیل نگاری اور استعارہ کے جادو سے انشائی نثر بنانے کا رواج سرسید کی نسل کی طرح ان کے ہاں بھی نظر آجاتا ہے فرق صرف یہ ہے کہ ان کے ہاں اصلاح پسند ادیب کی جھلک پہلوں کے مقابلے میں کم تھی۔اسی لئے فرحت اللہ بیگ سے لے کر ملا رموزی تک

استدلالیت اوراصلاح پسندانہ سنجیدگی کی جگہ شگفتگی اور زیرلب تبسم نے لے لی۔ اس تبدیلی کا اہم ترین اشارہ خودعلی گڑھ سے سجاد حیدر یلدرم تھے ۔نیرنگ خیال کی طرح ان کی کتاب ''خیالستان'' کے انشائیے بھی تراجم ہی تھےلیکن ترکی زبان سے۔سید مبارزالدین رفعت اور ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے انہیں انشائیے ہی قرار دیا ہے۔یلدرم اگر دل کے نمائندہ تھے تو ان کے معاصر نیاز فتح پوری دماغ کے ترجمان تھے۔ان کی تحریروں مثلاً برسات، ایک مصور فرشتہ ،عورت اور ایک رقاصہ کو کئی ناقدین نے انشائیے قرار دیاہے۔فرحت اللہ بیگ کے ہاں خوش طبعی ان کی تحریر کی اساس ہے۔ ان کے ہاں' 'اونہہ'' اور'' پٹنا'' انشائی رنگ کی عناصر دوتحریریں اہم ہیں۔خواجہ حسن نظامی کے مجموعہ''مضامین حسن نظامی'' اور'' سی پارہ دل'' (۱۳-۱۹۱۲)میں اختصار،شگفتگی اور غیر رسمی انداز جیسے انشائی عناصر کے حوالے سے الو، دیا سلائی ،جھینگر کا جنازہ ،الف خان اور آنسو کی سرگذشت جیسی تحریریں اہم ہیں ۔میر ناصر علی کی'' صلائے عام'' میں مضمون پریشاں نامی تحریریں مثلاً کسی کے آنے کا انتظار،مسکرانہ، ذکر خوباں، زندگی کی شام، ہم اور ہماری ہستی، بساط خیال اور یادش بخیر وغیرہ جیسے مضامین قابل توجہ ہے ۔نیاز فتح پوری نے ان کے مجموعہ مضامین مقامات ناصری کا مقدمہ''اردو کا پہلا اور آخری انشائیہ نگار'' کے عنوان سے لکھا تھا۔منشی محی الدین خلیق دہلوی کے ہاں بھی''میں'' سے بھرپور انشائیے مل جاتے ہیں۔سجاد انصاری کی''محشر خیال'' میں انشائی عناصر پر مشتمل تحریریں بھی قابل غور ہیں۔ ڈاکٹرانور سدید، وحید الدین سلیم،آغا شاعر قزلباش، شیخ عبدالقادر، عبدالرشید چشتی،منشی پریم چند، مولوی عزیز مرزا، مہدی افادی، فلک پیما، ابوالکلام آزاد ،حسن نظامی، رشید احمد صدیقی ، پطرس بخاری، کرشن چندر اور ممتاز مفتی وغیرہ کو بھی اس ضمن میں زیر بحث لائے ہیں۔جبکہ ڈاکٹر بشیر سیفی بھی عظیم بیگ چغتائی ،شوکت تھانوی، کنہیا لال کپور، سعادت حسن منٹو،شفیق الرحمٰن ،فکر تونسوی، محمد خالد اختر، مشتاق یوسفی، کرنل محمد خان اور مرزا منور جیسے جدید مصنفین کو اسی تسلسل میں بحث کا حصہ بنایا گیا ہے۔ اس مضمون میں زیرغور آنے والے تمام نام انشائیہ کے حوالے سے ان مرتب شدہ پانچ اہم کتب میں بھی مذکور ہیں۔:اول ۔اردو انشائیہ، مرتبہ سید صفی مرتضٰی ،دوم۔انشائیہ، مرتبہ ڈاکٹر آدم شیخ، سوم۔اردو ایسّیز،مرتبہ ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی ، چہارم۔اردو کا بہترین انشائی ادب،مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی اورپنجم۔جدید اردو انشائیہ،مرتبہ اکبرحمیدی۔

ماسٹر رام چندراور سرسید سے لے کر اب تک کے آخری نام تک کی تمام تحریریں کلی طور پر انشائیہ نگاری کے ضمن میں تسلیم نہیں کی گئیں''افسوس کہ سرسید اور ان کے مابعد ادیبوں میں سے کسی نے بھی مونتین اور بیکن سے استفادہ نہیں کیا۔''[۳۳] کیونکہ مقالہ نگاری، انشا پردازی، انشائے لطیف،طنزومزاح اور تمثیل نگاری کے اثرات کے مقابلے میں ان میں مونتین کےتصور انشائیہ کے حوالے سے فنی عناصر کلی طور پرنہیں بلکہ جزوی طور پر موجود رہے ہیں۔لہٰذا ان پرمختلف ناقدین کی آراء بھی مختلف ہیں ۔اس کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی ہے کہ ان تمام تحریروں کوتقریباً سوا سو سال کے بعد متعین کردہ انشائیہ کی تعریفوں پر پرکھنے کی کوشش کی جاتی ہے ۔لیکن اگر انہیں اردو انشائیہ نگاری کے ارتقا کے حوالے سے دیکھاجائے تو یہ سب اردوانشائیہ کی تاریخ کے پس منظر کے طور پر ایک قیمتی سرمائے کی صورت اختیار کر جاتی ہیں۔

------(د)------

قیام پاکستان کے بعداردو میں انشائیہ نگاری کی کوششیں جاری رہیں لیکن ان میں فنی سطح پر کافی نکھار آ گیا۔خاص کر ممتاز مفتی ،داؤد رہبر، جاوید صدیقی،نصیر آغا، امجد حسین، حسنین کاظمی اور غلام علی چودہری وغیرہ کی کاوشیں مونتین کے تصور انشائیہ کے قریب تر

تھیں۔لیکن یہ تحریریں انشائیہ کے نام کے بغیر چھپیں کیونکہ عام مضمون کے مقابلے میں ان تحریروں کے لئے کوئی نام حتمی طور پر رسائل یا متعلقہ کتب میں پیش نہیں کیا گیا۔حالانکہ ۱۹۴۴ء میں اختر اورینوی نے انشائیہ کا لفظ اصطلاحی سطح پر بطورصنف سخن مخصوص کر دیا تھالیکن وہ اس وقت رواج نہ پا سکا۔اس حوالے سے ایک اہم مثال ممتاز مفتی کی کتاب ''غبارے'' کی دی جاسکتی ہے جو۱۹۵۴ء میں مضامین کے مجموعے کی حیثیت میں شائع ہوئی لیکن ان کے بیشتر مضامین دراصل اپنے اسلوب وفن کے حوالے سے انشائیے ہی ہیں۔ اس حوالے سے فیصلہ کن بحث میرزا ادیب کے ادبی جریدے ادب لطیف میں وزیر آغا اور دیگر ادیبوں کے انشائیوں کی اشاعت سے شروع ہوئی ۔ان کے لئے کئی نام زیر بحث آئے ۔اگر ماضی سمیت تمام ناموں پر نظر دوڑائی جائے تو ان میں مطائبات ادب، طیفیہ، انشائے لطیف، یافت لطیف، لائٹ ایسّے ،اردو ایسّے، پارہ انشا، لطیف پارہ، مضمون لطیف، ادب پارہ، خیال پارہ اور نمک پارہ وغیرہ شامل ہیں۔آخر کار بعدازاں نہ صرف انشائیہ کا لفظ رواج پا گیا بلکہ انشائیہ نگاری ایک رجحان وتحریک کی صورت اختیار کر گئی ۔''اردو انشائیہ کی نمود اول ۱۹۵۸ء کے لگ بھگ ہوئی اس وقت اردو زبان بالعموم اور اردو نثر بالخصوص ارتقا کا خاصہ طویل سفر طے کر چکی تھی۔۔۔ اس نووارد صنف ادب کو انشائے لطیف ، خیال پارے ، ادب لطیف ، نثر پارہ کہنے کی سعی کی گئی ۔۔۔(پھر وزیر آغا کی تجویز پر)اس صنف کے لیے انشائیہ کا نام پیش کیا۔''[۳۴] اس سے انشائیہ نگاروں کی ایک کھیپ ظہور میں آنے کے علاوہ انشائیہ پر تنقیدی و تجزیاتی کام اس قدر سامنے آیا کہ مضمون اور انشائیہ کے درمیان مستقلاً حد امتیاز قائم ہوگئی۔

> انشائیہ کے بکھرے ہوئے نقوش تو ہمیں قدما کے یہاں بھی مل جاتے ہیں بالخصوص غالب کے مکاتیب کے چند ٹکڑے، سرسید کے کچھ مضامین، ابوالکلام آزاد کی تصنیف غبار خاطر کے چند مضامین اور کرشن چندر کے ایک دو مضامین انشائیہ کے ابتدائی نقوش کی نمائندگی کرتے ہیں، انشائیہ کے فطری ارتقا میں ہم ان ادیبوں کو نظر انداز نہیں کر سکتے لیکن انشائیہ کو اردو ادب میں بطور ایک علیحدہ صنف ادب کے وزیر آغا نے متعارف کرایا۔[۳۵]

سرسید عہد کی مغربی ادبیات میں مضمون نگاری نے متعدد صورتوں یعنی علمی و سائنسی ، طنزیہ و مزاحیہ مضامین کے ساتھ ساتھ انشائیہ یا لائٹ ایسے رقتا پزیر رہا۔ اردو انشائیہ کو بھی کچھ اسی طرح سرسید کی علمی مضمون نگاری اور فرحت اللہ بیگ سے مشتاق یوسفی تک کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کے بین بین غیر شعوری طور پر اپنایا گیا مگر اردو نثر کی پسماندگی اور مصنف کی عدم آگاہی کے باعث اس کے کلی فنی اوصاف اظہار نہ پا سکے۔یوں تقسیم ہند سے پہلے صرف ناصر علی دہلوی، سجاد انصاری، خواجہ حسن نظامی اور ابوالکلام آزاد ہی وہ مصنفین ہیں جن کے ہاں انشائیہ کی طرف پیش قدمی کے شواہد ملتے ہیں اور جو انشائیہ نگار بنتے بنتے رہ گئے۔اسی تسلسل میں ڈاکٹر وزیر آغا کا دعویٰ ہے کہ جب انہوں نے خود قیوم نظر کی ایما پر انشائیہ ''گری'' لکھا تو یہیں سے پاکستان میں انشائیہ نگاری کا آغاز ہوا۔[۳۶] اور انہوں نے ہی میرزا ادیب کی معاونت سے لفظ انشائیہ کو لائٹ ایسے کے لئے استعمال کرنے کا آغاز کیا۔یوں اردو انشائیہ نگاروں کی پہلی کھیپ مشکور حسین یاد، مشتاق قمر، جمیل آذر اور غلام جیلانی اصغر اور دوسری کھیپ متذکرہ سمیت انور سدید، کامل القادری، تقی حسین خسرو، احمد جمال پاشا، شہزاد احمد ، اکبر حمیدی، سلیم آغا قزلباش اور ارشد میر کی صورتوں میں پروان چڑھی اور انشائیہ نگاری باقاعدہ طور پر اردو ادب کا حصہ بن گئی ۔

ماخذات

۱۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، انشائیہ کے خدوخال، مکتبہ فکر و خیال، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۲۳
دیکھیے: سلیم اختر، ڈاکٹر، انشائیہ کی بنیاد، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۱۵
۲۔ ابو الاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء، ص ۱۸
۳۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، انشائیہ کی بنیاد، ص ۴۰
۴۔ ایضاً، ص ۱۱
۵۔ ڈاکٹر انور سدید، انشائیہ اردو ادب میں، مکتبہ فکر و خیال، لاہور، ۱۹۸۵ء، ص ۱۲۲
۶۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، انشائیہ کی بنیاد، ص ۱۵
۷۔ محمد احسن فاروقی، ڈاکٹر، تاریخ ادب انگریزی، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۶ء، ص ۱۶۰
۸۔ جمیل آذر، پروفیسر، انشائیہ اور انفرادی سوچ، نقش گر پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۰۴ء، ص ۱۲، ۱۳
۹۔ ڈاکٹر انور سدید، انشائیہ اردو ادب میں، ص ۱۲۳
۱۰۔ ایضاً، ص ۱۲۶
۱۱۔ بشیر سیفی، ڈاکٹر، اردو میں انشائیہ نگاری، نذیر پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۳۰
۱۲۔ ایضاً، ص ۲۶
۱۳۔ ابو الاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، ص ۱۸
۱۴۔ بشیر سیفی، ڈاکٹر، اردو میں انشائیہ نگاری، ص ۳۵
۱۵۔ دیکھئے: جاوید وشسٹ، ملا وجہی، نئی دہلی، ساہتیہ اکادمی، ۱۹۹۲ء
۱۶۔ دیکھئے: عبادت بریلوی، ڈاکٹر، ''انشائیہ سرسید کے عہد میں'' مطبوعا نئی قدریں شمارہ ۵۔۴، ۱۹۷۲ء، کراچی
۱۷۔ افتخار احمد صدیقی، مولوی نذیر احمد: احوال و آثار، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۸ء، ص ۶۶
۱۸۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر تاریخ، عزیز بک ڈپو، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۲۳۵
دیکھیے: انور سدید، ڈاکٹر'' انشائیہ: اردو ادب میں''، ص ۱۵۱ تا ۱۵۶
۱۹۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، سنگ میل پبلیکیشنز، اسلام آباد، ۲۰۰۴ء، ص ۵۲۷
دیکھیے: ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، مقدمہ مشمولہ'' ماسٹر رام چندر'' از ڈاکٹر صدیق قدوائی، شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی، ۱۹۶۱ء، ص ۴۶
دیکھیے:'' ماسٹر رام چندر اور اردو نثر کے ارتقا میں ان کا حصہ'' از ڈاکٹر سیدہ جعفر، کریم سنز، کراچی، ۱۹۷۸ء، ص ۸
۲۰۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، ص ۳۳۳
۲۱۔ محمد فرمان، پروفیسر، سرسید احمد خان، مشمولہ: تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، اردو ادب، مدیر عمومی: پروفیسر خواجہ زکریا، جلد چہارم، ۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۴ء، پنجاب یونیورسٹی، اسلام آباد، طبع دوم، ۲۰۱۰ء، ص ۵۶
۲۲۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، وجہی سے عبد الحق تک، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۸۸

۲۳۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، سر سید احمد خان اور ان کے نامورر فقا ء کی اردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۹۸

۲۴۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، وجہی سے عبد الحق تك، ص ۸۵

۲۵۔ اکبر حمیدی، جدید اردو انشائیہ، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۱ء، ص ۷۰

۲۶۔ نظیر صدیقی، تاثرات و تعصبات، مدرسہ عالیہ، ڈھاکہ، ۱۹۹۲ء، ص ۲۳۲

۲۷۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، سر سید احمد خان اور ان کے نامورر فقا ء کی اردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ، ص ۳۶

۲۸۔ حامد حسن قادری، داستان تاریخ اردو، اردو اکادمی سندھ، کراچی، ۱۹۶۶ء، ص ۱۶۹

۲۹۔ سلام سندیلوی، ڈاکٹر، ادب کا تنقیدی مطالعہ، ، میری لائبریری، لاہور، ۱۹۷۱ء، ص ۲۰۴

۳۰۔ محمد صادق، ڈاکٹر، محمد حسین آزاد: احوال و آثار، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۲۴، ۶۳، ۷۷، ۲۱۴

دیکھیے: محمد صادق، ڈاکٹر، (مرتبہ) مقدمہ، نیرنگ خیال، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۸ء، طبع دوم، ص ۴۸

۳۱۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر تاریخ، ص ۳۰۳

۳۲۔ بشیر سیفی، ڈاکٹر ''اردو میں انشائیہ نگاری''، ص ۱۸۴

۳۳۔ جمیل آذر، پروفیسر ''انشائیہ اور انفرادی سوچ''، ص ۱۶

۳۴۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو انشائیہ کے سو سال، مشمولہ: اردو کے بہترین انشائیے از جمیل آذر، مکتبہ اردو زبان، سرگودھا، ۱۹۷۱ء، ص ۵

۳۵۔ جمیل آذر، پروفیسر، اردو انشائیہ کی کہانی، ماہنامہ صریر، سالنامہ جون جولائی ۱۹۹۸، ص ۵۲

۳۶۔ خیابان، اصناف نمبر، مجلّہ شعبہ اردو، جامعہ پشاور، ۱۹۹۵ء، مدیر منور روؤف، پروفیسر، ص ۲۸۵۔۲۸۴۔۲۸۳